۹

مینار

اس سبق کی تدریس کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مجازی اور اصطلاحی مضمر میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے گفت گو کر سکیں۔
- افسانوی غیر افسانوی اقتباسات کو ان کے اسلوب اور بیان کے پیشِ نظر خاص مقاصد (تفہیم، تمہید، موازنہ وغیرہ کے لیے پڑھ سکیں۔
- افسانوی غیر افسانوی متن میں شامل مانوس و غیر مانوس الفاظ و تراکیب، محاورات، ضرب الامثال، مترادفات اور مرکبات پر مشتمل فقرات سمجھ کر برمحل استعمال کر سکیں۔
- مختلف مصنفین / شعرا کے ادب پارے پڑھ کر اس زمانے کی تاریخ سے واقف ہوتے ہوئے عصری تناظر میں اس کا تجزیہ کر سکیں۔
- مختلف مصنفین / شعرا کی تخلیقات اور ادب پاروں کو پڑھ سکیں اور اس زمانے کی تاریخ سے واقف ہو سکیں اور عصری تناظر میں اس کا تجزیہ و تبصرہ کر سکیں۔
- مضمون نویسی کے مختلف اندازِ تحریر (بیانیہ، مدلل، بحثی، تفصیلی اور تحقیقی و تنقیدی) کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف موضوعات کو قلم بند کر سکیں۔

خاص	خواہشِ قلبی	فرضِ منصبی	آثارِ قدیمہ	جہانِ نو	نشانِ خیر
الفاظ	بحث و تمحیص	بازنطینی	تخفیف	شہ نشیں	برشگال

ہدایات برائے اساتذہ کرام

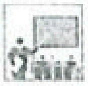

- طلبہ کو اردو میں انشائے لطیف کی روایت سے آگاہ کریں۔

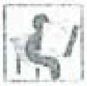

پڑھیں

پڑھنے سے پہلے بتائیں

محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کی ایک ایک نمائندہ تصنیف کا نام بتائیں۔

مینارِ قراردادِ پاکستان کی مجلسِ تعمیر کی نشست تھی، میز کے اِرد گرد تمام اراکین جمع تھے، میں آج اِن میں پہلی بار شامل ہوا تھا۔ کارروائی کی پہلی شِق غور کے لیے پیش ہوئی۔ میرا ذہن اُس وقت برنارڈ شا کے اِس مقولے پر غور کرنے میں مصروف تھا کہ وہ مقام جہاں خواہشِ قلبی اور فرضِ منصبی کی حدیں مل جائیں اُسے خوش بختی کہتے ہیں۔ میں بہ لحاظ عہدہ، اِس مجلس کی صدارت کر رہا ہوں مگر عہدے کو ایک عہدِ وفا کا لحاظ بھی تو لازم ہے۔ میرے عُہدے کا تعلق تعمیر سے ہے، میرے عہد کا تعلق تحریک سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اِسے سنگ و خشت کے بہ جائے جہانِ نو کی تعمیر اور افکارِ نو کی تعبیر سمجھا۔ میں نے اس مینار کو باالفاظِ اقبالؔ، جلوہ گہِ جبرئیل جانا۔

مینار کی تعمیر کے ابتدائی دنوں میں جب میرا، اُس کی تعمیر سے کوئی سرکاری تعلق نہ تھا میں محض تعلقِ خاطر کے واسطے سے وہاں جا پہنچا۔

بنیادیں بھری جا چکی تھیں، باغ میں ہر طرف ملبہ پھیلا ہوا تھا، مینار بلندی کی طرف مائل تھا، رُوکار بانسوں کی باڑ میں یوں چھپی ہوئی تھی کہ عمارت تو نظر نہ آئی مگر اُردو شاعری میں چلمن کا مقام مجھ پر واضح ہو گیا۔ نزدیک جانا چاہا تو چوکی دار نے سختی سے روک دیا۔ یہ تو اس چوکی دار کا ہم سر نکلا جسے مولوی عبدالحق نے وائسرائے کو ٹوک دینے پر آثارِ قدیمہ سے نکال کر چند ہم عصروں میں شامل کر لیا تھا۔ اب کہاں روز روز عبدالحق پیدا ہوں گے اور کسے فرصت ہو گی کہ عصرِ نو کے ملبے میں عزتِ نفس کی تلاش کرے اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات پر مضمون لکھا کرے۔ میں نے چوکی دار سے پوچھا: یہ کیا بن رہا ہے؟ کہنے لگا: یادگار بن رہی ہے۔ آج جب کارروائی کے لیے پہلا مسئلہ پیش ہوا تو میں نے کہا اسے ملتوی کیجیے تاکہ ایک اور ضروری بات پر بحث ہو سکے۔ میز پر لغات کا ڈھیر لگ گیا۔ سب متفق ہوئے کہ یادگار وہ نشانِ خیر ہے جو مرنے کے بعد باقی رہے۔ جب یادگار کا عام تصور، موت اور فنا کے تصور سے جدا نہ پایا تو منصوبے سے یادگار کا لفظ خارج کر دیا۔ میز صاف کی گئی، لغات کی جگہ مینارِ قراردادِ پاکستان کے نقشے پھیلائے گئے۔ جو تھوڑی بہت جگہ بچ گئی اس میں چائے کی پیالیاں سجائی گئیں۔ چائے شروع ہوئی تو بات بہت دُور جا نکلی۔

کہتے ہیں جب اہرامِ مصر کا معمار موقعے پر پہنچا تو اس نے صحرا کی وُسعت دیکھ کر فیصلہ کیا کہ عمارت بلند ہونی چاہیے۔ پھر اُس نے بُھربُھری اور نرم ریت کو محسوس کیا اور سوچا کہ اس عمارت کو سنگلاخ بھی ہونا چاہیے۔ جب دھوپ میں ریت کے ذرے چمکنے لگے تو اُسے خیال آیا کہ اِس کی عمارت شعاعوں کو منعکس کرنے کے بہ جائے اگر جذب کر لے تو کیا اچھا تقابل ہو گا۔ ہوا چلی تو اُسے ٹیلوں کے نصف دائرے بنتے بگڑتے نظر آئے اور اُس نے اپنی عمارت کو نوک اور زاویے عطا کر دیے۔ اِتنے فیصلے کرنے کے بعد بھی اُسے طمانیت حاصل نہ ہوئی تو اُس نے طے کیا کہ زندگی تو ایک قلیل اور مختصر وقفہ ہے وہ کیوں نہ موت کو ایک جلیل اور پائے دار مکان بنا دے۔ اب جو یہ مکان بنا تو لوگوں نے دیکھا کہ عجائبِ عالم کی فہرست میں اضافہ ہو گیا ہے۔

اہرام کے معمار کو اگر اقبال پارک میں لا کھڑا کرتے تو اُسے نہ جانے کیا کچھ نظر آتا اور وہ اس عمارت کو نہ معلوم کیا شکل دیتا۔ اُس کی غیر حاضری میں ہمیں یہ طے کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی کہ قراردادِ پاکستان کو علامت اور عمارت کے طور پر کیا صورت دی جائے۔ باغ، جھیل، فوارے، مسجد، کتب خانہ، عجائب گھر، ہال، ہسپتال، دروازہ، درس گاہ یا مینار۔ فہرست کچھ اس قسم کی بنی تھی اور بحث و تمحیص کے بعد کام یابی کا سہرا سر مینار سجایا گیا۔ موقع و محل کی نسبت ہو یا صورت و ساخت کی نسبت؛ ماہرین کا متفق ہونا ممکن نہیں۔ اقبال پارک کے مشرق اور شمال میں وسعت اور ہریالی، مغرب میں ایک محلہ، کچھ جھگیاں اور گندہ نالا، جنوب میں قلعہ، گوردوارہ اور مسجد عالم گیری واقع ہے۔ سطحِ زمین سے دیکھا جائے تو تین سفید بیضوی، نوک دار گنبد اور چار بلند سرخ پہلو دار مینار اِس قطعے پر حاوی ہیں۔ ذرا بلندی سے دیکھیں تو اندرون شہر، دریائے راوی اور جہاں گیر کے مقبرے کے چار مینار بھی اِس منظر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آٹھ میناروں کے ہوتے ہوئے نویں مینار کا اِضافہ کسی نے حُسن جانا اور کسی نے بد ذوقی۔ اس بات کو البتہ سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ عمارت اپنی نسبت کی حیثیت سے منفرد ہے۔ دنیا میں کسی قرارداد کو منظور کرنے کی یاد اس طرح نہیں منائی گئی کہ جلسہ گاہ میں ایک مینار تعمیر کر دیا جائے۔

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ مینار کی ابتدائی صورت؛ دفاعی ضرورت کے تحت وجود میں آئی، پھر اس کی علامتی حیثیت قائم ہوئی۔ اِس کے بعد یہ دین کا ستون بنا اور آخر کار نشانِ خیر کے طور پر بنایا جانے لگا۔ مینارِ قرارداد؛ اِن ساری حیثیتوں پر محیط ہے۔ یہ نظریاتی دفاع کی ضرورت، تحریکِ آزادی کی علامت، دین کی سرفرازی کا گواہ اور ہماری تاریخ کا ایک نشانِ خیر ہے۔

دفاعی میناریوں تو میسوپوٹیمیا کی اختراع بتائے جاتے ہیں مگر اِن کو سب سے زیادہ استعمال کرنے والے اہلِ روم اور بازنطینی تھے۔ اُن کے یہاں شہر کی فصیل سے لے کر ہر بڑی حویلی میں جابہ جا مینار بنے ہوئے تھے۔ اُن دنوں دنیا کی آبادی مختصر اور جغرافیے کا علم کم تر تھا۔ فنِ حرب کا درجہ بھی

پست تھا۔ حملہ آور گنے چنے اور اُن کے ہتھیار دیکھے بھالے تھے۔ لہٰذا دفاع کے لیے یہ کوتاہ قامت مینار ہی بہت کافی تھے۔ علم اور آبادی دونوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ فنِ حرب کا درجہ بھی بلند ہوتا چلا گیا۔ جنگوں کی تعداد اور شدت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ جگہ جگہ مضبوط سے مضبوط تر اور بلند سے بلند تر مینار بننے لگے۔ آبنائے باسفورس، جنوبی فرانس اور وسط چین کی مشہور فصیلیں اور مینار اسی دور کی یادگار ہیں۔ دیوارِ چین میں، جو آب ہاتھی کے دانت کی طرح صرف دکھانے کے آتی ہے، جابہ جا دفاعی مینار اور بُرج بنے ہوئے ہیں۔ چین گئے تو دیوار دیکھنے کی خواہش کا اظہار کی۔ دیوار بھی دیکھی اور اہلِ دیوار بھی۔ معلوم ہوا کہ جو کام پہلے دیواروں سے لیا جاتا تھا اب وہ دیوانوں سے لیتے ہیں۔ جہاں لوگ شانہ بہ شانہ، صف بہ صف ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں تو وہی سدِ سکندری ہے اور وہی سدِ یاجوج۔ ایک دن ہم دیوار کی طرف روانہ ہوئے، سڑک میدان سے گزر کر پہاڑی سلسلے میں داخل ہو چکی تھی۔ دُور سے ایسا معلوم ہوا کہ جہاں پہاڑ اور افق ملتے ہیں وہاں کسی نے سیاہ پنسل سے ایک مدھم سی لکیر لگا دی ہے۔ کچھ اور آگے گئے تو دُور تک سلسلۂ کوہ سنجافی نظر آیا۔ نزدیک پہنچے تو یہ مدھم سی لکیر حیرت کدۂ ہنر بن گئی اور جسے ہم نے سنجاف سمجھا تھا، وہ ایک سنگلاخ حقیقت نکلی۔ دیوار عموداً ایک پہاڑی پر چڑھتی تھی اور چوٹی پر ایک دفاعی مینار بنا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے پچاس یوآن کا نوٹ نکالا اور ساتھیوں سے کہا کہ یہ انعام مینار پر سب سے پہلے پہنچنے والے کو ملے گا۔ سبھی بھاگ پڑے اور میں نے جانا کہ یہ نوجوان بھی پس ماندہ ملکوں کی طرح زرِ مبادلہ کی دوڑ میں شریک ہو گئے ہیں۔ ذرا سی دیر میں بھاگنے والوں کا دم پھول گیا اور ایک ایک کر کے فرش پر بیٹھ گئے۔ مینار اب بھی اُتنا ہی دُور نظر آتا تھا اور اگر اس میں یہ خوبی نہ ہوتی تو اب تک دیوارِ چین میں کئی بار نقب لگ چکی ہوتی۔ یہ کام جو بڑے بڑے ملک نہ کر سکے، اُردو شاعری نے کر دکھایا، شعر ہے:

میرے شیون سے فقط قصرِ فریدوں نہ گرا
سدِ اسکندر ، اورنگ نشیں بیٹھ گئی

اب صرف حضرت ناظم کو جن کا یہ شعر ہے، کیوں قصوروار ٹھہرایئے۔ قصور ہے تو خود ہمارے مزاج کا۔ دیوارِ چین تو نہیں البتہ دیوارِ چمن تو حضرت غالبؔ نے بھی ڈھا دی تھی، کہتے ہیں:

ہر شکالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل ، سو جا سے دیوارِ چمن

دفاعی مینار پر چڑھنے کی جو حسرت دل کی دل میں رہ گئی تھی اُسے میں نے مغربی پاکستان کے قبائلی علاقے میں جا کر پورا کیا۔ میں نے ایک سردار کے یہاں کھانا کھایا اور مہمان کا حق آسائش استعمال کرتے ہوئے مٹی کے اُس مینار پر جا چڑھا جو حویلی کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ باہر سے تو اس کی لپائی کی ہوئی تھی مگر اندر سے مینار تاریک اور خستہ تھا۔ خاک ریزے سے روشنی کی جو کرن اندر آتی تھی وہی ہمارا زینہ تھا۔ مینار کی شہ نشین میں ایک ٹوٹی کرسی اور چند کارتوس پڑے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک ٹرانسسٹر بج رہا تھا۔ میں نے کبھی ٹاٹ میں مخمل کا پیوند تو نہیں دیکھا مگر میسوپوٹیمیا کے دفاعی میناروں کی طرز کے ہزارہا سال پرانے مٹی کے میناروں میں بیسویں صدی کا گاتا بجاتا پیوند لگا ہوا ضرور دیکھا۔ سمندر کے کنارے جو مینار نشانِ راہ کے طور پر بنائے جاتے ہیں اُن کے بالائی حصے رات کو روشن رہتے ہیں اس لیے اُنھیں ''روشن مینار'' کہتے ہیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ مینار طوفانی علاقوں میں خطرناک چٹانوں پر بنائے جاتے ہیں اور ان میں رات کو روشنی کرنے والے کی زندگی جفاکشی اور تنہائی سے عبارت ہے۔ اگر طوفان آ جائے تو دنوں تک اہلِ مینار کا تعلق دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے۔ میں ایک ایسا ہی روشن مینار دیکھنے گیا۔ ہر چیز بدل چکی تھی۔ روشنی اب تیل سے نہیں بلکہ گیس اور بجلی سے کی جاتی

ہے۔ مینار والے کی نوکری تخفیف میں آچکی ہے۔ ان میناروں کو کسی رکھوالے کی ضرورت نہیں رہی۔ سبک ساران ساحل شام کو بٹن نیچے کر دیتے ہیں اور صبح کو اوپر۔ آہستہ آہستہ پرانے بادہ کش اٹھتے جا رہے ہیں۔ ترقی نے انفرادی صفات کے اظہار کی کتنی ہی راہیں بند کر دی ہیں اور شجاعت زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں غیر ضروری بلکہ مضر قرار دے دی گئی ہے۔

میں نے ایک اور روشن مینار بھی دیکھا ہے۔ پہلے تو یہ میرے ذہن میں نقشے پر لگے ہوئے نقطے کی صورت میں محفوظ رہا اور پھر ایک دن آنکھیں جھپکیں تو وہ نقطہ مینار بن چکا تھا۔ ایشیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو سائبیریا سے لنکا تک خشکی نظر آتی ہے۔ لنکا کے جزیرے کی شکل نقطے میں دیکھا تو گمان گزرا جیسے قدرت کی آنکھوں سے خشکی کا آخری قطرہ ٹپک کر سمندر میں گر پڑا ہو۔ اس جزیرے کی جنوبی حد ہمارے نقشے میں زمین کی آخری حد تھی۔ اسکول کے طالب علم نے سوچا کہ خشکی کی اس حدِ آخر پر کھڑا ہو کر اگر یہ کہیں کہ ایشیا میرے قدموں میں سائبیریا تک پھیلا ہوا ہے تو یہ بات جغرافیے کی رُو سے درست اور تاریخ کی رُو سے نادرست ہوگی۔ یہ خیال نہ جانے کب آیا اور کتنے سال لاشعور میں گم رہنے کے بعد ایک دن مسکراتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ میں ایک بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ اعلان ہوا کہ اب ہم لنکا کے گرد گھومتے ہوئے جزیرے کی جنوبی حد کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں چمک آگئی، سامنے جزیرے کے آخری ساحل پر ایک روشن مینار دمک رہا تھا۔

(آوازِ دوست)

مختار مسعود (۱۹۲۶ء تا ۲۰۱۷ء)

مختار مسعود کی پیدائش سیال کوٹ میں ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ان کے والد معروف اقبال شناس اور معاشیات کے استاد شیخ عطاءاللہ کا تعلق ضلع گجرات کے علاقے جلال پور جٹاں سے تھا اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں معاشیات مضمون کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ والد کے علمی کارناموں اور علامہ اقبالؒ سے عقیدت کا اثر مختار مسعود پر بھی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مختار مسعود اردو، اسلام، اقبال اور پاکستان سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد والد صاحب کے ساتھ پاکستان آئے اور مقابلے کا امتحان پاس کر کے سول سروسز میں مختلف عہدوں پر تعینات ہو کر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جس زمانے میں ''مینارِ پاکستان'' کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا اُس وقت مختار مسعود لاہور کے کمشنر تھے۔ مختار مسعود ہی نے اس کا نام ''یادگارِ پاکستان'' سے ''مینارِ پاکستان'' کرایا تھا۔

مختار مسعود کی اہم تصانیف میں ''آوازِ دوست''، ''سفر نصیب''، ''لوحِ ایام'' اور ''حرفِ شوق'' شامل ہیں۔ مختار مسعود کے منفرد اسلوب میں ان کی زبان و بیان اور روز مرہ محاورے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ نپی تلی نثر، نفاست سے تراشی ہوئی تراکیب، تہذیب و شائستگی میں رچی بسی جملہ آرائی اور تاریخ و ادب کے حوالے جات مختار مسعود کے اسلوبِ تحریر کو امتیازی حیثیت عطا کرتے ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں مختار مسعود کو حکومتِ پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے نوازا گیا۔

مشق

ا۔ درج ذیل عبارت کو پڑھ کر دیے گئے سوالات کے جواب لکھیں:

دفاعی مینار پر چڑھنے کی جو حسرت دل کی دل میں رہ گئی تھی اُسے میں نے مغربی پاکستان کے قبائلی علاقے میں جا کر پورا کیا۔ میں نے ایک سردار کے یہاں کھانا کھایا اور مہمان کا حق آسائش استعمال کرتے ہوئے مٹی کے اُس مینار پر جا چڑھا جو حویلی کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ باہر سے تو اس کی لپائی کی ہوئی تھی مگر اندر سے مینار تاریک اور خستہ تھا۔ خاک ریزے سے روشنی کی جو کرن اندر آتی تھی وہی ہمارا زینہ تھا۔ مینار کی شہ نشین میں ایک ٹوٹی کرسی اور چند کارتوس پڑے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک ٹرانسسٹر بج رہا تھا۔ میں نے کبھی ٹاٹ میں مخمل کا پیوند تو نہیں دیکھا مگر میسوپوٹیمیا کے دفاعی میناروں کی طرز کے ہزارہا سال پرانے مٹی کے میناروں میں بیسویں صدی کا گاتا بجاتا پیوند لگا ہوا ضرور دیکھا۔ سمندر کے کنارے جو مینار نشانِ راہ کے طور پر بنائے جاتے ہیں اُن کے بالائی حصے رات کو روشن رہتے ہیں اس لیے اُنھیں ''روشن مینار'' کہتے ہیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ مینار طوفانی علاقوں میں خطرناک چٹانوں پر بنائے جاتے ہیں اور ان میں رات کو روشنی کرنے والے کی زندگی جفاکشی اور تنہائی سے عبارت ہے۔ اگر طوفان آ جائے تو دنوں تک اہلِ مینار کا تعلق دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے۔ میں ایک ایسا ہی روشن مینار دیکھنے گیا۔ ہر چیز بدل چکی تھی۔ روشنی اب تیل سے نہیں بلکہ گیس اور بجلی سے کی جاتی ہے۔ مینار والے کی نوکری تخفیف میں آ چکی ہے۔ ان میناروں کو کسی رکھوالے کی ضرورت نہیں رہی ٹیک سارانِ ساحل شام کو بٹن نیچے کر دیتے ہیں اور صبح کو اوپر۔ آہستہ آہستہ پرانے بادہ کش اٹھتے جا رہے ہیں۔ ترقی نے انفرادی صفات کے اظہار کی کتنی ہی راہیں بند کر دی ہیں اور شجاعت زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں غیر ضروری بلکہ مضر قرار دے دی گئی ہے۔

سوالات:

الف۔ مصنف نے دفاعی مینار پر چڑھنے کی حسرت کہاں اور کیسے پوری کی؟

ب۔ مٹی کے مینار کی باہر اور اندر سے کیا حالت تھی؟

ج۔ سمندر کے کنارے بنے میناروں کو ''روشن مینار'' کیوں کہا جاتا ہے؟

د۔ روشن میناروں کے متعلق مصنف نے کیا سن رکھا تھا؟

ہ۔ مصنف کے مطابق اب روشن میناروں کی دنیا کس حد تک بدل چکی ہے؟

اصطلاحی، مجازی معانی:

لغوی معانی کے علاوہ کئی لفظوں کے مجازی معانی بھی ملتے ہیں اور انھیں لغوی معنوں کے بعد درج کیا جاتا ہے۔ مثلاً: بنیادی طور پر مجازی سے مراد کوئی بھی ایسی شے ہوتی ہے جو اپنی ماہیت اور روح میں تو اصل یا حقیقی جیسی ہو یا اس سے قریب ہو مگر حقیقی نہ ہو۔ جیسے ایک انسان کے سائے کو ایک انسان کی ساخت سے تشبیہ دے دی جائے۔ تو یہ سایہ انسان کے لیے مجازی تصور ہوگا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ اس کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ یہاں لفظ ''سایہ'' اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کے لغوی اور مجازی معنوں کے ساتھ ساتھ دیگر مفاہیم میں اصطلاحی معانی بھی آتے ہیں۔ مثلاً: مطلع کے لغوی معانی ہیں، طلوع ہونے یا نکلنے کی کیفیت یا موسم کی کیفیت۔ لیکن اصطلاح میں غزل یا قصیدے کا پہلا شعر؛ جس کے دونوں مصرعے آپس میں ہم قافیہ یا ہم قافیہ ہم ردیف ہوں۔

۲۔ طلبہ مجازی اور اصطلاحی محضر کی درج بالا وضاحت کو پیش نظر رکھ کر اپنا ذاتی نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے گفت گو کریں۔

۳۔ درج ذیل افسانوی اقتباس (ڈراما: دستک) اور غیر افسانوی اقتباس (مزاحیہ مضمون: سویرے جو کل آنکھ میری کھلی) کو ان اسلوب اور بیان کے پیش نظر خاص مقاصد (تفہیم، تجزیہ، موازنہ وغیرہ) کے لیے پڑھیں۔ جہاں مشکل پیش آئے، اپنے استاد محترم/استانی صاحبہ سے رہ نمائی حاصل کریں:

(1)

(ڈاکٹر زیدی کا کمرا:

ڈاکٹر صاحب پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ عمر پچپن کے لگ بھگ، فرنچ کٹ ڈاڑھی، چہرے پر نقاہت نمایاں۔ اس وقت انھوں نے کمبل لپیٹ رکھا ہے۔ پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر مختلف شیشیاں۔

رات، طوفان، تیز و تند ہوا کا مستقل شور ہوتا رہتا ہے۔ بیگم زیدی آرام کرسی پر بیٹھی کسی رسالے کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ عمر پچاس کے قریب، سردی کی وجہ سے شال اوڑھ رکھی ہے۔

ڈاکٹر زیدی کچھ سوچتے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ یکایک اُن کی نظر سامنے دروازے پر جا پڑتی ہے جس پر نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ بیگم اُنھیں دیکھتی ہیں اور پھر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ کہتے ہیں مگر بہت آہستہ۔ صرف اُن کے ہونٹ حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر کمبل اپنے جسم سے ہٹانے لگتے ہیں۔ بیگم کی نظر پڑتی ہے۔)

بیگم: کیا ہے زیدی؟

زیدی: دستک سنی؟

بیگم: دستک!!!

زیدی: سنی نہیں تم نے؟

(ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ رک جاتے ہیں)

بیگم: ہو تو سنوں بھی! کہاں ہے دستک؟

زیدی: کہاں ہے دستک؟ یہ کیا کہ رہی ہو تم؟ دیکھو تو جا کر۔ کوئی آیا ہے دروازے پر، کوئی کھٹکھٹا رہا ہے دروازہ!

بیگم: کوئی نہیں!

زیدی: صاف آواز آ رہی ہے۔ نہیں جانا چاہتیں تو میں خود۔۔۔

(ڈاکٹر صاحب کمبل ہٹانے لگتے ہیں۔)

(بیگم رسالہ کرسی پر رکھ کر اٹھتی ہیں اور ان کی طرف آتی ہیں۔)

بیگم: کیا کر رہے ہیں آپ!

زیدی: دیکھتا ہوں دروازے پر کون ہے؟ تم تو جاتی ہی نہیں!!

بیگم: مہربانی کر کے بیٹھے رہیے، دروازے پر کوئی بھی نہیں۔

زیدی: تو یہ دستک؟

(بیگم اُن کے گرد کمبل لپٹنے لگتی ہے)

بیگم: تیز ہوا کا شور ہے۔

زیدی: تیز ہوا دروازے پر دستک دیا کرتی ہے! تم جا کے دیکھو تو ذرا۔

بیگم: میں کہتی ہوں کوئی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں!

زیدی: ذرا سنو تو۔ صاف، بالکل صاف۔۔۔ دستک نہیں تو اور کیا ہے؟

بیگم: آپ کا وہم ہے!

زیدی: دیکھو اب زیادہ زور سے ہونے لگی ہے۔ یہ وہم ہے کیا؟

(پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیگم اُن کا ہاتھ پکڑ لیتی ہیں)

بیگم: خدا کے لیے لیٹے رہیے۔ آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر ہو کر ایسی حرکتیں کر رہے ہیں، اپنی حالت کا ذرا خیال کریں۔

زیدی: تم ایک مرتبہ جا کر دیکھ نہیں آتیں۔

بیگم: میں جانتی ہوں دروازے پر کوئی نہیں۔ خیر دیکھ آتی ہوں۔

(یوں سر کو جُنبش دیتی ہیں جیسے اس کام کو بے کار سمجھ رہی ہیں۔ دروازے کی طرف جاتی ہیں۔ زیدی اُنھیں ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ بیگم پردے کے پیچھے چلی جاتی ہیں دو تین لمحوں کے بعد پردے سے باہر آتی ہیں۔)

(2)

گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہم چاری سے برسبیلِ تذکرہ کہ بیٹھے کہ: ''لالہ جی! امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی جگا دیا کیجیے۔''

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے، نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اُٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے، ابھی سے کیا فکر؟ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے لیکن یہ گولہ باری لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی اور کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بے داری کا قائل ہونا ہی پڑا مگر اب بھی دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا، میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں: ''اچھا! اچھا! تھینک یو، جاگ گیا ہوں، بہت اچھا! نوازش ہے۔'' آں جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے۔ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں ''قُم'' کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے۔ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے۔ پیش تر اِس کے کہ باہر بستر سے نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اِس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لیمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

۴۔ میرامن دہلوی کی تحریر ''باغ و بہار'' کے حصے ''شروع قصے کا'' کے متن سے لیے گئے درج ذیل مانوس و غیر مانوس الفاظ و تراکیب،، محاورات، ضرب الامثال، مترادفات، مرکبات پر مشتمل فقرات کو سمجھ کر پڑھیں اور موقعے کی مناسبت سے اپنی گفت گو میں برمحل ان کا استعمال کریں:

۔ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔
۔یہی ارمان جی میں باقی ہے کہ میرا نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں۔
۔ایسے چین سے گزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید اور رات، شبِ برات تھی۔
۔کئی سلطان نعل بندی دیتے تھے۔
۔بادشاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے۔
۔سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کوئی کام نہ تھا۔
۔ایک نظر دیکھ کر قدم بوسی کروں تو خاطر جمع ہو۔
۔زار بہ زار رونے اور دُبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے۔
۔وہ مثل ہے: ساری رات سوئے، اب صبح کو بھی نہ جاگیں۔
۔جب دوپہر ہوئی، برخاست ہو کر اندرونِ محل داخل ہوئے، خاصہ نوشِ جاں فرما کر خواب گاہ میں آرام کیا۔
۔جب تھوڑی شب باقی رہے، تب لوٹ پوٹ رہیں گے۔

۵۔سعادت حسن منٹو کا معروف افسانہ "نیا قانون" بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے سیاسی حالات اور عوامی بے داری کی عکاسی کرتا ہے۔ درج ذیل اقتباس کو پڑھیں اور اُس زمانے کی تاریخ سے واقف ہوتے ہوئے عصری تناظر میں اس کا تجزیہ و تبصرہ کریں کہ کیا واقعی موجودہ دور میں حکم ران طبقہ عوام کے حقوق کے لیے صحیح معنوں میں عملی اقدامات کر رہا ہے یا پھر منگو کوچوان کی طرح محض عوام کو دھوکے میں رکھا ہوا ہے۔ ان کی زندگی میں بدلنا کچھ نہیں ہے اور عوام کے سر پر اشرافیہ نے مسلط ہی رہنا ہے۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس کی چیخ پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا: "پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچہ!"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا اس کی چوڑی چھاتی پھولی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منھ سے جھاگ بہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔۔۔ اب نیا قانون ہے میاں۔۔۔ نیا قانون!"

اور بے چارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون، نیا قانون۔ کیا بک رہے ہو۔۔۔ قانون وہی ہے پرانا!!!" اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

اُردو نثر میں مضمون کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کسی موضوع پر اپنے افکار و خیالات اور جذبات کو مربوط اور مدلّل انداز میں لکھنا اور اپنی رائے کا اظہار کرنا مضمون نویسی کہلاتا ہے۔ مضمون لکھتے وقت کچھ اصول و ضوابط کا خیال رکھنا پڑتا ہے جن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، سنجیدہ یا مزاحیہ موضوعات کو احاطۂ تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔ مضمون تین حصّوں پر مشتمل ہوتا ہے:

(i)۔ تمہید یا تعارف (ii)۔ اصل مضمون / نفسِ مضمون / متن (iii)۔ اختتام یا ذاتی رائے

مضمون کئی زاویوں اور انداز سے لکھا جا سکتا ہے۔ دلیل والا مضمون؛ تحقیقاتی مواد، اعداد و شمار اور مضمون نگار کی ذاتی رائے پر مشتمل ہوگا۔ بڑے پیمانے پر کی گئی تحقیقات پر مشتمل اس مضمون کی زبان سیدھی سادی زبان استعمال ہوتی ہے۔ وضاحتی مضمون میں کسی موضوع پر وضاحت کے ساتھ غیر جانب داری کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ وضاحتی مضمون کا مقصد کسی موضوع پر رائے بنائے بغیر اس کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ کسی خاص شعبے میں مضمون نگار کی مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔

موازنہ اور تضاد مضمون دو پہلوؤں پر بحث کرتا ہے، مماثلت اور فرق کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ اس مضمون میں ایک پیرا گراف مماثلت اور ایک پیرا گراف اختلاف پر بحث کے لیے مختص کیا جاتا ہے۔ وجہ اور اثر مضمون میں بتایا جاتا ہے کہ چیزیں اس طرح کیوں ہیں؛ وہ کیسے وقوع پذیر ہوئیں؛ اور آگے کیا ہوگا۔ اس قسم کا مضمون لکھتے وقت واقعات کے دو مجموعوں کے درمیان ایک منطقی تعلق پیدا کیا جاتا ہے۔

بیانیہ مضمون ایک کہانی بتاتا ہے اور عمومی طور پر ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہ مضمون باہمی تجربے کو پھیلانے کے لیے رقم کیا جاتا ہے۔ اس مضمون نے مختلف قسم کے چیلنجز کی کھوج لگانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وضاحتی مضمون ایک مختصر قسم کا مضمون ہوتا ہے اور عام طور پر ایک صفحے کو محیط ہوتا ہے۔ جہاں ادب، کتاب، ناول، افسانے، ڈرامے یا شاعری کی وضاحت کی جاتی ہے۔ جب کہ تفصیلی مضمون میں کسی بھی موضوع پر حتی المقدور تمام تفصیلات لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان تفصیلات کو مختلف پیرا گرافوں میں ایک مربوط انداز میں تحریر کیا جاتا ہے۔ بحثی مضمون میں مضمون نگار اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ موضوع کے دو مقامات، پہلوؤں اور زاویوں سے آگاہ ہے۔

٦۔ مضمون نویسی کے مختلف اندازِ تحریر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل موضوعات کو قلم بند کریں:

الف۔ موسمیاتی / ماحولیاتی تبدیلیاں

ب۔ آئینِ پاکستان اور حقوقِ انسانی

ج۔ بین المذاہب ہم آہنگی

د۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی

سرگرمی

انٹرنیٹ کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کے پانچ معروف میناروں کی تصاویر ڈاؤن لوڈ کریں۔ ہر مینار کا پانچ پانچ سطروں میں مختصر تعارف لکھ کر جماعت کے دیگر ساتھیوں کے سامنے پیش کریں۔